Article
Critical writings of Dr.Wazir Aagha (1980 to 2000)

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقیدی نگارشات (1980ء تا 2000ء)

Dr. Arif Siddique[*1]
SST, Govt High School, Haider abad town, Sargodha

1ڈاکٹر عارف صدیق
ایس ایس ٹی، گورنمنٹ ہائی سکول، حیدر آباد ٹاؤن، سرگودھا

Correspondance: arifsiddique2424@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 30-06-2023
Accepted:14-09-2023
Online:30-09-2023

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Dr.Wazir Aagha has made significant contribution to the Urdu Language and literature. Most of his work is based upon critical topics, essays and theories. His writings has notable impact on Urdu critics. His literary work is source of inspiration for new generations of readers and writers, exemplifying the power of critical thinking and intellectual exploration. His critical lens, characterized by its profound depth, intellectual rigor, and unwavering commitment to literary excellence, shaped the landscape of Urdu criticism for decades. Agha introduced and championed several groundbreaking theories in Urdu criticism, including Marxist criticism, existentialism, and structuralism. He adeptly applied these Western frameworks to analyze Urdu literature, offering fresh perspectives and sparking intellectual discourse.

KEYWORDS: Wazir Aagha, Critical theories, Urdu Literature, Indigneous perspective , Modern School of thought.

ڈاکٹر وزیر آغا کا تخلیقی و تنقیدی سفر قریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ زندگی کے آخری ایام تک اُن کا قلم رواں رہا۔ شاعری، انشائیہ نگاری اور تنقید ان کے پسندیدہ میدان ہیں جن میں وہ اپنے قلم کے جوہر دکھاتے رہے۔ تنقیدی حوالے سے یوں تو ان کی کئی تصانیف ہیں تاہم موضوع کے زمانی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جن تنقیدی تصانیف کو زیرِ بحث لایا گیا ہے ان میں "نئے تناظر" (1981ء)، "دائرے اور لکیریں" (1986ء)، "قومی یکجہتی اور ادب کا کردار" (1986ء)، "تنقید اور جدید اُردو تنقید" (1989ء)، "انشائیہ کے خدوخال" (1990ء)، "ساختیات اور سائنس" (1991ء)، "دستک اس دروازے پر" (1993ء)، اور "معنی اور تناظر" (1998ء) شامل ہیں۔

اُردو ادب میں ڈاکٹر وزیر آغا شاعر، ادیب، انشائیہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے ایک خاص مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ تنقید کے میدان میں انھوں نے متنوع موضوعات پر بدلتے ہوئے سماجی تناظر کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ جب ہم ان کی تنقید نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ نہ تو خود کسی خاص تحریک یا گروہ سے منسلک ہوئے اور نہ ہی ان کے نزدیک نقاد یا ادیب کو کسی تحریک یا گروہ سے منسلک ہونا چاہیے۔ ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

> "اگر آپ کسی خاص تحریک یا گروہ سے وابستہ ہو جائیں گے تو کسی بھی فن پارے کا درست انداز میں تجزیہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ اس طرح آپ پر اس تحریک یا گروہ کے نظریات غالب ہوں گے اور آپ فن پارے کو ایک خاص انداز سے دیکھیں گے اگر وہ آپ کے نظریات پر پورا اترا تو ٹھیک ورنہ رد کر دیں گے جبکہ تنقید کے لیے ضروری ہے کہ فن پارے کو ہر انداز میں جانچنے کی کوشش کی جائے۔
> (1)"

ڈاکٹر وزیر آغا نقاد کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ تخلیق کار کی طرح ذوق نظر سے کام لے اور فن پارے یا تخلیق کے بارے میں تنقیدی رائے کا اظہار کرتے وقت کسی ایک مسلک کے نظریات کو ہی سامنے نہ رکھے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے نقاد کسی تخلیق کی قدر (Value) کا تعین کرنے کی بجائے صرف اس کی مقدار یا جسامت کا ہی تعین کر پائے گا اور اس کے اصل اسرار و رموز تک رسائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس طرح تنقید چند معائب و محاسن تو سامنے لا سکے گی لیکن ایک ادبی رویہ بننے سے قاصر رہے گی۔

نقاد اور تنقید کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے خاصا وزن رکھتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نقاد کسی خاص مسلک سے خود کو پابند نہیں کرتا بلکہ محض ذوق نظر سے فن پارے کا جائزہ لیتا ہے تو پھر مختلف دبستانوں کے وجود میں آنے کے محرکات کیا ہے؟ دبستان بھی تو اسی وقت وجود میں آتا ہے جب کسی خاص نظریہ یا کسی خاص نقطہ نظر رکھنے والے ناقدین ایک گروہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور انفرادی کی بجائے اجتماعی طور پر نظریات کا پرچار کرتے ہیں۔ دبستان کے وجود میں آنے کی اصل بھی تو ایک فرد ہی ہوتا ہے جو ایک خاص نقطہ نظر سے فن پارے کو دیکھتا ہے اور اپنے نظریات اور احساسات کے ذریعے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں اس کے ہم عصر ناقدین میں سے بعض تو اس کے ساتھ موافقت کا رویہ رکھتے ہیں اور بعض ناموافقت کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اس طرح اس کے موافق ناقدین کا جو گروہ بنے گا وہ کم و بیش اسی کے نظریات کا پرچار کریں گے یوں ایک دبستان وجود میں آئے گا۔ دوسری

طرف اس کے مخالف ناقدین بھی ایک نکتہ نظر پر اجتماع کر لیتے ہیں اور پھر بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق دیگر افراد اس کے نظریات سے اتفاق یا اختلاف کر کے دبستان کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر وزیر آغا دبستان اور تحریک کی تشکیل کے مخالف نہیں ہیں۔ انہوں نے خود ترقی پسند، حلقہ ارباب ذوق، اسلامی ادب کی تحریک، پاکستانی ادب کی تحریک کے ساتھ ساتھ اُردو تنقید میں عمرانی، جمالیاتی، نفسیاتی دبستانوں کے عروج و زوال اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور ان کی افادیت اور مضمرات سے خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ وہ کسی ادبی گروہ بندی یا مسلک کے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ وہ صرف ایک گروہ کے نظریہ پر تکیہ کر کے بیٹھ جانے اور دیگر دبستانوں کے نظریات کو نظر انداز کر دینے کے مخالف ہیں۔ وہ تمام مکتبہ ہائے فکر کے نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے تخلیق اور فن پارے کا تنقیدی تجزیہ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اس عمل کو وہ "امتزاجی تنقید" کا نام دیتے ہیں۔ اسی امتزاجی نظریہ سازی کی وجہ سے ان کی تنقید جمود کا شکار نہیں ہوتی بلکہ وہ نت نئے انداز میں تخلیق کا تجزیہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تنقید کی جو خاص بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ تنقیدی رائے کے لیے تخلیق کو منتخب کرنے کے بعد اپنے نظریات اس پر نہیں ٹھونستے بلکہ جس انداز کے تنقیدی تجزیہ کا تقاضا تخلیق کرتی ہے وہ اسی انداز سے اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تخلیق کے جواہر ریزوں کے ساتھ ساتھ سنگ ریزے بھی سامنے لاتے ہیں۔ کیونکہ وہ تنقیدی مطالعہ کو تخلیق کے عیوب و محاسن کا آئینہ دار قرار دیتے ہیں، اس لیے وہ نقاد کے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ ادب کا تاریخی جائزہ لینے پر قادر ہو۔ لیکن وہ یہاں بھی نقاد کو مؤرخ نہیں بناتے بلکہ نقاد اور مؤرخ کے درمیان ایک خاص فرق واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں مؤرخ غیر شخصی انداز میں گزشتہ واقعات اور تحریکات کا جائزہ لے کر حقائق سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے جب کہ نقاد ادبی ذوق نظر کے ذریعے سلجھے ہوئے انداز میں واقعات و تحریکات کا جائزہ لیتا ہے اور یوں تنقید ایک طرح کا تخلیقی عمل قرار پاتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا تنقید کے مقاصد اور مناصب کو بڑی صراحت سے بیان کرتے ہیں۔ وہ تنقید کو ایک ایسا ہتھیار سمجھتے ہیں جس کے ذریعے ادب کی تفہیم اور تشریح کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی اور غیر ادبی تحریروں میں امتیاز بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ تنقید کے ذریعے ادب کی تفہیم و تشریح تو کی جا سکتی ہے لیکن تنقید ادب کی پر اسراریت کو پوری طرح گرفت میں لینے پر قادر نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پر اسراریت تمام تر خدوخال اور حدود سے ماورا ہوتی ہے اگر اسے خدوخال عطا کر کے اس کی حدود کا بھی تعین کر دیا جائے تو پھر پر اسراریت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ادب میں چونکہ پر اسراریت ختم نہیں ہوتی اس لیے نقاد بھی صرف ایک حد تک ادب کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک تنقید کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ متعلقہ صنف کے اندر چھپے ہوئے اسرار رموز کو بے نقاب کر کے اس صنف کے ارتقاء کا باعث بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ تنقید نہ صرف کسی دور کے ادب میں روایت پرستی کے رجحان کو سامنے لائے بلکہ اس امر کی بھی نشاندہی کرے کہ ادیب کس حد تک تقلیدی روش اختیار کر رہا ہے اور اس روش کے حوالے سے بھی تنقید معاون کا کردار ادا کرے۔ روایت پرستی کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا ایک خاص نکتہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ روایت سے انحراف کو بھی اچھا خیال نہیں کرتے بلکہ روایت سے انسلاک پر زور دیتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک روایت سے منسلک ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ کولھو کے بیل کی طرح ایک مخصوص دائرے میں گھومتے چلے جائیں۔ وہ روایت سے منسلک ہونے کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ ماضی کے

ورثہ کو ساتھ لے کر عصری تقاضوں کے مطابق میں ترمیم و تنسیخ کرتے ہوئے عصر حاضر کو سنواریں اور اس کے ساتھ ساتھ مستقبل میں آنے والے رجحانات کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے نظریات میں لچک پیدا کی جائے تاکہ ان نظریات میں ترمیم و تنسیخ کا عمل مسلسل جاری رہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نقاد کے لیے عصر حاضر سے واقفیت ضروری سمجھتے ہیں لیکن وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہر شخص چوں کہ بدلتے ہوئے عصری رجحانات سے خاطر خواہ اثرات قبول کرتا ہے اور بعض اوقات مختلف حادثات و واقعات سے براہ راست تعلق ہونے کی وجہ سے معاشرے کے عام فرد کی طرح نقاد بھی جذباتیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نقاد کسی تخلیق کو عصر حاضر کے حوالے سے ہی نہ پرکھے بلکہ تمام تر تعصبات اور جذباتیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے تخلیق کے اصلی مقصد اور اس کے اندر چھپے ہوئے معنی کی بازیافت کا کام کرے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری ان کے تفکر اور تجزیاتی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ ایک متحرک ذہن کے مالک تھے اور ہر لحظہ بدلتے رجحانات کے ساتھ ساتھ ادبی اور تنقیدی حوالے سے نہ صرف نظریات پیش کرتے رہے بلکہ ان نظریات کی توضیح اور عملی طور پر ان کے ذریعے ادب پارے کو پرکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اردو تنقید میں مغرب سے آنے والے جدید اور مابعد جدیدت نظریات نے ایک خاص ہلچل پیدا کی۔ بعض ناقدین نے ان نظریات کو مغربی گمراہیوں سے تعبیر کیا تو بعض نے ان سے مفید کام لینے کی ٹھانی۔ ڈاکٹر وزیر آغا ان ناقدین میں سے ہیں جنہوں نے نہ صرف ان مغربی نظریات کی تفہیم کی کوشش کی بلکہ عصری اور سماجی تقاضوں کے مطابق ان سے فن پارے اور تخلیق کی جانچ پرکھ کا کام بھی لیا ہے۔

جدید اور مابعد جدید تنقیدی نظریات کی حوالے سے ان کی تصانیف "تنقید اور جدید اُردو تنقید" اور "ساختیات اور سائنس" میں مفصل بحث ہے جبکہ "دستک اس دروازے پر" اور دیگر کئی تصانیف میں جزوی طور پر ان نظریات کی توضیح و تشریح اور اُردو تنقید میں ان کے استعمال پر بحث ملتی ہے۔

"تنقید اور جدید اُردو تنقید" کو انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں تنقید کا پس منظر اور مغرب میں تنقید کے جزر و مد کے حوالے سے بحث ہے۔ جبکہ کہ دوسرے حصہ میں جدید اُردو تنقید کا پس منظر، آغاز، افقی اور عمودی تناظر بڑی وضاحت کی ساتھ بیان کرتے ہوئے جدید اُردو تنقید کے امتزاجی اسلوب پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ جدید اُردو تنقید کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا یہ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ یہ مغرب سے آئی اور اُردو تنقید نے اسے اپنے اندر سمونے میں بڑی فراخی کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں جدید اُردو تنقید کے مغربی نظریات سے پہلے اُردو ناقدین کے ہاں زیادہ تر عربی زبان میں رائج تنقیدی نظریات اور اقوال کا استعمال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں لفظ کی اہمیت بہت زیادہ تھی کیونکہ عربی ناقدین اسلوب بیان کو ہی تخلیق کی اصل برتری کا معیار ٹھہراتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر سماجی اور اقتصادی حوالے سے دیکھا جائے تو عربوں کا عام پیشہ تجارت تھا اور تجارت میں لفظ کی اہمیت مسلمہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے عربی ناقدین اور ان کے زیر اثر اُردو ناقدین کی زیادہ بحث بھی لفظ کے گرد ہی گھومتی رہی۔ مغربی تنقیدی نظریات کا اُردو میں آغاز وہ سر سید کے ہاں تلاش کرتے ہیں۔ سر سید تحریک کے زیر اثر ہی حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" کو وہ مغربی نظریات کی اُردو میں آمد کا نقطہ آغاز قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں مغربی تنقید کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ اس تصنیف میں ڈاکٹر وزیر

آغا نے مغرب سے آئے ہوئے نظریات نقد مثلاً جدیدیت، اسلوبیات، ساختیات اور پس ساختیات وغیرہ پر کھل کر بحث کی ہے اور اُردو میں ان تنقیدی نظریات کے عروج وزوال اور اردو ادب پر ان کے اثرات بڑے موثر انداز میں بیان کیے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید کی ایک اہم جہت پاکستانی قومیت کا تصور ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اُردو ادب اور تنقید میں پاکستانی اور اسلامی قومیت کا تصور خوب پروان چڑھا۔ تاہم اس تصور قومیت پر جس قدر کام ڈاکٹر وزیر آغا نے کیا کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں قومیت کا تصور دھرتی کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ وہ دھرتی اور ثقافت سے گہری وابستگی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری اور تنقید مےں دھرتی اور ثقافت سے ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ انہوں نے شعر وادب کی بنیادیں دھرتی اور ثقافت سے منسلک کر کے پاکستانی ادب کی زیادہ بہتر انداز سے نظریہ سازی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ثقافت اور دھرتی سے وابستگی کے ساتھ ساتھ وہ ثقافت کے تشکیلی عناصر پر بھی خوب بحث کرتے ہیں۔ پاکستانی ثقافت کی تشکیل کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "پاکستان کی ثقافت اور ادب کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مؤقف یہ ہے کہ اس کی تشکیل میں مذہب کے گہرے اثرات کے علاوہ پاکستان کی مٹی، ہوا، موسم اور اس کی تاریخ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور پاکستانی کی مٹی کی کہانی ہند اسلامی ثقافت کے دور سے بہت پہلے ان ایام تک پھیلی ہوئی ہے جب اس خطہ ارض پر وادی سندھ کی تہذیب نے جنم لیا تھا۔"(2)

انور سدید کے اس استدلال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک ثقافت کی تشکیل میں مذہب کے علاوہ دیگر تاریخی وتہذیبی عناصر بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں قومیت کے تصور کے حوالے سے بنیادی اہمیت زمین یا دھرتی کو ہی حاصل ہے۔ آسمان کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں آسمان کی حیثیت ثانوی ہی رہتی ہے۔

دھرتی سے وابستگی کا نظریہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس دور میں پیش کیا جب پاکستان میں جدید ادب کی تحریک کا آغاز ہو رہا تھا اور اسی تحریک کے زیر اثر اردو ادب و تنقید میں متنوع نظریات سامنے آرہے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے اس نظریہ کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ ایک لحاظ سے یہ جدت کا حامل نظریہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی و ملکی تشخص کی بقا اور ارتقاء میں بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ملک و قوم سے گہری وابستگی رکھنے والے ادیبوں نے اس نظریہ کو بہت جلد قبول کر لیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے دھرتی کے احساس کو تخلیقی عمل میں بھی اُجاگر کر کے ادبی قومیت کی اساس کا کام کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی دھرتی سے وابستگی کے اس نظریے پر بہت سے اعتراضات بھی سامنے آئے۔ ناقدین اور معترضین نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ان کے ہاں غیر اسلامی "دھرتی پوجا" کے عناصر ملتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اکثر ناقدین ان کے تصور قومیت کی درست تفہیم نہیں کر سکے تھے ورنہ حقیقت میں یہ نظریہ دھرتی پوجا کا نہیں بلکہ دھرتی اور ثقافت کے سماجی تناظر سے ہم آہنگ ہونے کا ہے۔ اس نظریہ کے ذریعے ڈاکٹر وزیر آغا ادب اور تنقید دونوں کو ملکی حالات سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اس

لیے اس نظریے میں اسلامی شعار سے بغاوت کا کوئی عنصر شامل نہیں بلکہ حب الوطنی جھلکتی ہے جس سے ان کا قومی طرز احساس پوری شدت سے ابھرتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی دھرتی سے گہری وابستگی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ گاؤں میں گزارا ہے۔ گاؤں کی فضاء مےں فطرت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔فطرت سے وابستگی ہر ادیب اور نقاد کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے، نہ تو کوئی ادیب فطرت سے روگردانی کر کے اچھا ادب تخلیق کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نقاد فطری تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ادب کی درست تفہیم و تشریح کر سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ گاؤں کی فضا نے ڈاکٹر وزیر آغا کے تخلیقی و تنقیدی شعور کو خاص طور پر جلا بخشی اور ان کے فطرت سے ہم آہنگ ہونے میں بنیادی کردار ادا کیا ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

> "میں نے چونکہ اپنی ساری عمر گاؤں میں گزاری ہے۔اس لیے میرا فطرت سے تعلق کثیر الجہت ہے۔میں نے فطرت کے متشدد روپ کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔میرے لیے فطرت محض درختوں، وادیوں، پرندوں اور فصلوں کے پر سکون عالم کا نام نہیں ہے بلکہ ان عناصر فطرت کا نام بھی ہے جن کی اپنی منطق ہے۔علاوہ ازیں میں اس کرۂ ارض کو نظام شمسی کو اور لاکھوں ستاروں پر مشتمل کہکشاؤں کو بھی فطرت کے مظاہر ہی میں شمار کرتا ہوں لہٰذا میرے لیے فطرت کے روبرو آنے سے مراد پوری کائنات کے روبرو آنا ہے۔"(3)

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک دھرتی پوجا سے مراد اپنی تہذیب و تمدن سے ہم آہنگ ہونے اور ادب و تنقید دونوں کو تہذیب و ثقافت کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لینا ہے۔"دھرتی پوجا" کی ترکیب وہ ارض کے روحانی ارتقاء کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور یہی روحانی ارتقا ان کے نزدیک فنون لطیفہ کے پیکروں میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔دھرتی سے وابستگی کے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے طارق حبیب لکھتے ہیں:

> "زمین اور دھرتی کے اپنے بھید اور اسرار ہوا کرتے ہیں اور زمین کے اثرات کا مطالعہ جہاں دلچسپی کا باعث ہے وہاں کچھ مشکلات کا داعی بھی ہے، تاہم زبان و ادب کو تہذیبی زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کا انداز ڈاکٹر وزیر آغا کا پسندیدہ بھی ہے اور وہ اس پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں۔(4)

طارق حبیب کی اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دھرتی پوجا کا نظریہ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک تہذیب و تمدن سے ہم آہنگی کا نظریہ ہے جو زبان و ادب اور تنقید کے لیے بہت ضروری ہے۔

ادب کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغاز کا نکتہ نظر یہ ہے کہ ادب کے لیے کوئی موضوع مخصوص نہیں ہوتا اور نہ ہی ادب کی کوئی متعین حدود ہوتی ہے۔ادب کی تخلیق ان کے نزدیک قطعاً ایک آزاد عمل ہے جو ایک صادق جذبہ کے زیر اثر ہوتی ہے۔یہ صادق جذبہ ادیب کے دل میں موجود ہوتا ہے۔اگر ادیب اس صادق جذبہ کو بروئے کار لا کر ادب تخلیق کرے گا تو وہ ادب حقیقی معنوں میں

عظیم ادب ہو گا۔ لیکن اگر اس صادق جذبہ کی بجائے محض کسی کے حکم یا فرمائش پر ادب تخلیق کرے گا تو نہ تو وہ ادب عظیم ادب کہلانے کا حق دار ہو گا اور نہ ہی اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ایسا ادب محض پراپیگنڈہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ادب کی مقصدیت کے قائل ہیں ادب کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میری رائے یہ ہے کہ ادب کبھی بے معنی نہیں ہو سکتا۔۔۔ مگر یہ مقصد زندگی کے شعبوں کے مقاصد سے قطعاً جدا ہے اور جمالیاتی تسکین کے ذریعے تزکیہ نفس پر منتج ہوتا ہے۔ ادب اپنے خالق اور قاری دونوں کے جذباتی تشنج کو فرو کر کے انہیں ایک ارفع تر انسانی سطح پر لے آنے کی کوشش کرتا ہے۔" (5)

ڈاکٹر وزیر آغا ادب کی تخلیق میں ادیب کی شخصیت کے عمل دخل کے بارے میں واضح نکتہ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادیب کی شخصیت کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے لیے کچھ اصول وضوابط کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ادیب کی اپنی خواہشات کا ادب میں عمل دخل بڑھ جائے تو یہ ادب کی حقیقی روح کے منافی ہو گا اور ادب پر جذباتیت غالب آ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر ادیب اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر ادب تخلیق کرتا ہے تو ایسی صورت میں وہ صرف اس "علم کی تفسیر" ہی پیش کرے گا جو مختلف نظری اور بصری ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ ایسے ادب میں تخیل کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہو گا، اس صورت حال میں اس تخلیق کو ادب کہنا خود لفظ "ادب" کی توہین کے مترادف ہے۔ ان کی نزدیک ادب میں ادیب کی ذاتی خواہشات کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ:

"خواہش جذبے میں منتقل ہو اور جذبے کو تخیل کے پر عطا ہوں تو ادب کے گنبد بے در میں داخل ہونے کی اجازت ملتی ہے ورنہ نہیں۔" (6)

ڈاکٹر وزیر آغا شخصیت کو ادب کی تخلیق کے رستے میں رکاوٹ تصور نہیں کرتے بلکہ شخصیت اور تخلیق میں گہرے تعلق کے روادار ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ادیب صرف اپنی ذاتی خواہشات کو ہی ادب میں سمو تا نہ چلا جائے بلکہ اس کی شخصیت موم کی طرح پگھلتی ہوئی، خواہشات کو تخیل کی حد پر لے جا کر تخلیق میں جذب کرے ایسی صورت میں ہی بڑا ادب تخلیق ہو سکتا ہے۔

ادب میں شخصیت کے عمل دخل کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا عصری حالات سے آگاہی بھی ادیب کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ ادیب کو عصر حاضر کے سیاسی و سماجی حالات سے باخبر ہونا چاہیے۔ کوئی بھی ادیب عصر حاضر کے حالات سے آنکھیں چرا کر اچھی تخلیق نہیں کر سکتا یہ ایک اٹل حقیقت ہے ادیب اگر عصر حاضر سے بے خبر رہنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو وہ اس میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ادیب کی تخلیق میں عصر حاضر کی عکاسی ضرور ہوتی ہے اور وہ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اپنی تخلیق میں قطع و برید کرتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ادیب کے لیے ضروری سمجھتے ہیں جہاں ایک طرف اس کی عصر حاضر کے ہنگامی حالات پر دقیق نظر ہو وہاں وہ ان ہنگامی حالات سے نپٹنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔

بنیادی نظریات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا نے مختلف اصناف ادب کے بارے میں بھی اپنے تنقیدی نظریات نمایاں انداز میں بیان کئے ہیں۔ اصناف ادب کے حوالے سے یوں تو کم و بیش ہر صنف کے بارے میں ان کی تنقیدی آراء ملتی ہیں تاہم شاعری اور

انشائیہ خاص طور پر تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے شاعری اور انشائیہ کے بارے میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ان دونوں اصناف پر زیادہ بحث کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود ایک اچھے شاعر اور بہترین انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انشائیوں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

شاعری کے لیے بنیادی عنصر تخیل ہوتا ہے تخیل کا اظہار شاعری کی صورت میں سامنے آتا ہے اور شاعر اپنے احساسات اور خیالات قاری تک منتقل کرنے کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا شاعری کے بارے میں نظریہ یہ ہے کہ:

> "اچھی شاعری منطق کی زبان میں نہیں متخیلہ کی زبان میں بات کرتی ہے، علامتوں کا سہارا لیتی ہے اور نظریے کے بجائے ان احساسات اور تخیلات کی ترسیل کا اہتمام کرتی ہے جن سے حسب ضرورت نظریات بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ تاہم شاعری اصلاً احساسات و تخیلات کی ترسیل ہی کا نام ہے اور اسے وصول کرنے کے لیے بھی احساس ہی کا ریسونگ سیٹ درکار ہے جہاں ریسونگ سیٹ نہیں ہوتا وہاں شاعری وجود میں آ بھی جائے تو خلق خدا کے سروں کے اوپر سے گزر جاتی ہے" (7)

ڈاکٹر وزیر آغا کی اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف شاعر بلکہ قاری اور سامع کے لیے بھی احساس اور ذوق لطیف کی ضرورت ہے۔ بصورت دیگر وہ شاعری سے نہ تو حظ حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی وہ شاعری کی درست تفہیم کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا شاعری کی اساس، شعری آہنگ کو قرار دیتے ہیں جو کہ لفظوں کی موزونیت سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں اچھی شاعری میں ایک صوتی فضا اور صوتی آہنگ پایا جاتا ہے اگر شاعری صوتی آہنگ سے عاری ہو گی تو اس کا اثر زائل ہو جائے گا ۔اس کے علاوہ وہ شاعری کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس سے قاری جمالیاتی حظ حاصل کر سکے۔ وہ نقاد کے لیے بھی یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ ایسی شاعری ہی کی توضیح و تشریح کرے جو جمالیاتی حظ پہنچانے کا باعث ہو۔ شاعری کے بارے میں اپنے تنقیدی طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "جب میں کوئی اچھی نظم پڑھتا ہوں تو فی الفور اس کی توضیح و تشریح کا کام شروع نہیں کر دیتا۔ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ توضیح و تشریح یعنی متن کو کھولنے کا تو صرف اس وقت جواز بنتا ہے جب متن جمالیاتی حظ مہیا کرنے کے قابل ہو۔ لہذا پہلی شرط یہ ہے کہ متن فنی اور جمالیاتی طور پر Authentic ہو۔ اگر متن فن کے معیار پر پورا نہیں اترتا تو پھر اس کی تشریح و توضیح ایک کار فضول ہے۔" (8)

نظم کی جو خصوصیت قاری کو متاثر کرتی ہے وہ دراصل اس کا صوتی آہنگ ہی تو ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ یہ آہنگ سرگوشی کی سطح پر ہو۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں اگر آہنگ، سرگوشی کی سطح سے بلند ہو جائے اور نظم میں بار بار ایک ہی بات کو دہرایا جانے لگے تو نظم کا اصلی اور حقیقی آہنگ قائم نہیں رہا بلکہ اس کی جگہ مصنوعی آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقی آہنگ وہ ہے جو لفظوں اور

لائنوں کو ایک خاص صوتی بہاؤ مہیا کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ تمثیلوں، امیجز، تشبیہوں، استعاروں اور لفظی ترکیبوں کے ذریعے الفاظ کی معنیاتی سطح بھی سامنے آئے اور قاری معنوی سطح تک رسائی حاصل کر سکے۔

شاعری کی علاوہ دیگر اصناف ادب میں سے ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید کا اہم میدان انشائیہ کی تنقید ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا خود ایک اچھے انشائیہ نگار تھے۔ ان کے انشائیوں کے مجموعے "خیال پارے "1966ء"چوری سے یاری تک "1966ء"دوسرا کنارہ "1982ء، "سمندر اگر میرے اندر گرے "1989ء اور "پگڈنڈی سے روڈ رولر تک "1995ء میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ بنیادی طور پر ایک اچھے انشائیہ نگار ہونے کی وجہ سے وہ انشائیہ کی صنف کے اسرار و رموز سے خاصی واقفیت رکھتے اور وقتاً فوقتاً اس صنف ادب کے بارے میں اپنے تنقیدی نظریات و خیالات کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں۔ ان کی کتاب "انشائیہ کے خدو خال "(1990ء) انشائیہ کی تنقید کے حوالے سے ایک معتبر تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے انشائیہ کی تفہیم کر کے اردو ادب میں انشائیہ کی پیش رفت اور مغربی انشائیوں کے اردو تراجم کی حوالے سے بحث کر کے انشائیہ کے خدو خال واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ انشائیہ کو ایک ایسی تحریر قرار دیتے ہیں جس میں انشائیہ نگار، اسلوب کی تخلیقی تازگی کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اشیا یا مظاہر کے مخفی مفہوم کو بھی گرفت لے کر شعور کی توسیع کا اہتمام کرتا ہے۔ اچھے انشائیہ کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایک اچھا انشائیہ پڑھنے کے دوران آپ شاید حظ، مزاح، طنز، تعجب، اکتساب علم اور تخیل کی سبک روی، ایسے بہت سے مراحل سے روشناس ہوں لیکن انشائیہ کے خاتمے پر آپ کو محسوس ہو گا آپ نے زندگی کے کسی مخفی گوشے پر روشنی کا ایک نیا پر تو دیکھا ہے اور آپ زندگی عام سطح سے اوپر اٹھ آئے ہیں۔" (9)

انشائیہ کا کام صرف مزاح پیدا کرنا اور حظ کی کیفیت عطا کرنا نہیں ہے بلکہ ایک اچھا انشائیہ نگار قاری کے تفکر کو جھنجھوڑتا بھی ہے اور اسے زندگی کی عام سطح سے اوپر اٹھا کر مخفی گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے "عدم تکمیل" کو انشائیہ کے بنیادی اوصاف میں شامل کیا جاتا ہے۔ یعنی انشائیہ نگار قاری پر سب کچھ منکشف نہیں کر دیتا بلکہ اسے دور ایک منزل کا سراغ دکھا کر خود الگ ہو جاتا ہے۔

انشائیہ میں اختصار، تازگی و شگفتگی موجود ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں جدت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جہاں تک اردو میں انشائیہ نگاری کی صنف کے آغاز کا تعلق ہے تو، ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں اردو میں انشائیہ نگاری کے بنیادی اصول تو مغرب ہی سے آئے ہیں لیکن انشائیہ نے اردو ادب میں بطور صنف اپنا ایک منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔

دلکش اسلوب نگارش کسی بھی تحریر کی جان ہوتی ہے کوئی بھی تحریر فکری حوالے سے کتنی ہی پختگی کی حامل اور اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہو جب تک وہ دلکش اور آسان فہم انداز میں قاری کے سامنے پیش نہیں کی جائے گی اس وقت تک نہ صرف قاری اس کی تفہیم سے قاصر رہے گا بلکہ بعض اوقات اس تخلیق کے اصل مقاصد بھی حاصل نہیں ہو پاتے۔ تنقید نگاری بنیادی طور پر ایک مشکل فن ہے مختلف نظریات اور تصورات کو وحدت میں پیش کرنا حقیقت میں جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جب تک نقاد کو اسلوب

تحریر پر عبور حاصل نہیں ہو گا اس وقت تک وہ اپنے خیالات اور احساسات کو قاری کے ذہن میں منتقل کرنے سے قاصر رہے گا۔ اچھا نقاد اپنے دلکش اسلوب نگارش سے قاری کو مطمئن کر سکتا ہے۔

جب ہم ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی اسلوب کا فنی جائزہ لیتے ہیں تو بنیادی طور پر ایک شاعر اور انشائیہ نگار ہونے کی وجہ ان کے تنقیدی اسلوب میں بھی شاعرانہ چاشنی اور انشائیہ کی سی شگفتگی ملتی ہے۔ وہ مختلف فنی محاسن کے ذریعے اپنے تنقیدی اسلوب کو اس قدر آسان فہم بنا کر پیش کرتے ہیں کہ پڑھتے وقت قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان کے دل کش اور شگفتہ اسلوب نگارش کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے عنوانات ہی سے ان کے اسلوب کی خوبی نمایاں ہوتی ہے۔ تنقیدی مضامین کے عنوانات کا انتخاب کرتے وقت وہ آسان فہم عنوانات منتخب کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ وہ کسی ناول یا تخلیق کے نام پر ہی مضمون کا عنوان رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً "خالی آسماں" (شہزاد احمد کا مجموعہ کلام "خالی آسماں")، "محبت لفظ تھا میرا" (عرش صدیقی کی نظموں کا مجموعہ "محبت لفظ میرا")، "دروازہ" (خالدہ حسین کا افسانوی مجموعہ "دروازہ")، "ماس اور مٹی" (منشا یاد کا افسانوی مجموعہ "ماس اور مٹی")، جیسے عنوانات ان تخلیقات کے ناموں پر ہیں جن کے بارے میں ان مضامین میں تنقیدی بحث کی گئی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے اسلوب کا ایک اہم وصف ان کا مضمون شروع کرنے کا انداز ہے۔ وہ مبہم اور نامانوس انداز کے بجائے مضمون کے عنوان کے مطابق آغاز ہی سے اصل موضوع پر بات شروع کر دیتے ہیں اور قاری کو بلاوجہ طلسم ہوشربا کی سیر کرانے سے گریز کرتے ہیں۔ ایک شاعر ہونے کے ناتے ان کے تنقیدی اسلوب میں بھی شاعرانہ فنی محاسن جابجا ملتے ہیں۔ مثلاً تشبیہات کا استعمال دیکھئے:

> "میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ انشائیہ نگار ایک ایسے جزیرے کی طرح ہے جو
> چاروں طرف سے مواج سمندر میں گھرا ہوا ہے"(10)

تشبیہات کے ساتھ ساتھ وہ استعارات کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں:

> "اس اعلان کو سن کر برہنگی میں ملبوس بہت سے "بادشاہوں" نے احتجاج بھی کیا مگر
> انور سدید اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے"(11)

تکرار لفظی کے ذریعے اسلوب کی دلکشی ملاحظہ ہو:

> "اسے کسی جگہ قرار نہیں۔ شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ، در بہ در وہ زندگی بھر ایک
> سفر مسلسل میں مبتلا رہا ہے"(12)

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری کے اس جائزے اور ان کے تنقیدی نظریات کی تفہیم سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک شاعر ہونے کی وجہ سے ان کی تنقید میں بھی شعر کی لطافت اور بصیرت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور غور و فکر ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی و تنقیدی بصیرت کے ذریعے ہر لحظہ بدلتے رجحانات کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو ادب اور تنقید میں جتنے بھی نئے رجحانات نظریات سامنے آئے ہیں انہوں نے ہر ایک پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ ایک

متحرک اور وسیع ذہن کے مالک تھے اور ہر دور کے تقاضوں سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مغربی تنقیدی نظریات پر ان کی تنقیدی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر مناظر عاشق ھرگانوی لکھتے ہیں:

> ”ڈاکٹر وزیر آغا نے ساختیات، پس ساختیات، ساخت شکنی، اور نئی تاریخیت کے سلسلے میں کھلے ذہن سے جتنی بحثیں کی ہیں ان کے پیش نظر انہیں بابائے جدید ذہن کہنا بے جا نہیں ہوگا“(13)

مجموعی طور پر بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا اردو ادب اور تنقید میں ایک معتبر مقام و مرتبہ کے حامل تھے ان کی تنقید نگاری نے بدلتے ہوئے رجحانات سے اردو ادب کو ہم آہنگ کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ بلاشبہ لائق صد تحسین ہے ۔اپنے عہد کے ایک متنازع نقاد ہونے کے باوجود ان کے تنقیدی نظریات ادب و تنقید کو ہر دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ انٹرویو، ڈاکٹر وزیر آغا، بر رہائش، سلیم آغا، کینٹ، لاہور، 16 اکتوبر 2008ء

2۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 2004ء، ص:614

3۔ راوی کے لیے انٹرویو، مشمولہ، مکالمات، مرتبہ، انور سدید، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، اکتوبر 1991ء، ص230

4۔ طارق حبیب، میراجی شناسی میں ڈاکٹر وزیر آغا کا حصہ، مشمولہ، سہ ماہی، شبیہ، خوشاب، جلد:16، شمارہ:2-1، جنوری تا جون 2007، ص78

5۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ادب اور مقصدیت، مشمولہ، دائرے اور لکیریں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، 1986ء، ص167

6۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ادب اور شخصیت، مشمولہ، پہلا ورق، مرتبہ، حیدر قریشی، راغب شکیب، مکتبہ ہم زبان، کراچی، جنوری 1990ء، ص:88

7۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، عریاں مکاں، مشمولہ، دائرے اور لکیریں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، 1986ء، ص120

8۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دستک اس دروازے پر، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، جون 1993، ص180

9۔ وزیر آغا، ڈاکٹر انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، 1990ء، ص10

10۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، 1990ء، ص53

11۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو تنقید کا مردِ آہن، مشمولہ، دائرے اور لکیریں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، 1986ء، ص69

12۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، غزل، مشمولہ، دائرے اور لکیریں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور 1986ء، ص111

13۔ ھرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر، وزیر آغا کی امتزاجی نظریہ سازی، پنڈی اسلام آباد ادبی سوسائٹی (پیاس)، راولپنڈی، 1996ء، ص:171